"آم تو آ گئے ہیں، چنبیلے ہیں۔" بڑی آپا بولیں "بوند پانی کی پڑے تو آم میں رس پڑے۔"

کیریاں امیاں بنیں، امیوں میں بجلی پڑی، بجلی جالی بنی اور جالی نے گٹھلی کی وضع لی۔ آسماں بدستور تانا بنا ہوا تھا، اور آم اسی طرح چنبیلے تھے۔ اوپر سے بوند نہیں پڑی اور اندر سے رس نہیں پھوٹا۔ روز اسی انداز سے سورج چڑھتا اور حویلی کے وسیع آنگن میں دھوپ اور چھانوں کی آویزش شروع رہتی، چھانوں پیچھے ہٹتے ہٹتے نیم کے نیچے سمٹ آتی اور سورج سر پر آجاتا۔ ڈیرڑا اٹھتا اور سب کے سب بڑے کمرے میں، نیم اندھیری فضا، لہراتا چھالر والا پنکھا، دروازوں پہ لگی ہوئی خس کی بھیگی بھیگی ٹٹیاں، آنکھوں میں اور بدن میں ٹھنڈک اترنے لگتی فرش پہ پہلے دسترخوان بچھتا، پھر اسی فرش پہ لیٹے لیٹے بڑی آپا اور تائی اماں اور امی اونگھنے لگتیں۔ "بی بی یہ بچے تو ذرا آنکھ نہیں لگنے دیتے" تائی اماں اونگھتے اونگھتے چونک پڑتیں۔ بڑی آپا بنی کو ڈانٹتیں "اب تو سوئے گی نہیں؟" اور تائی اماں زبردستی اچھے کو اپنی بغل میں لٹا لیتیں۔ ان کی آنکھیں پھر بند ہونے لگتیں۔ رفتہ رفتہ فرش پر لیٹے ہوئے سب لوگوں کو نیند آ لیتی۔ بہت دیر بعد خراٹے لیتے لیتے بڑی آپا چونکتیں "کیا بج گیا ضمیر؟" "ڈھائی" اور بڑی آپا کی آنکھیں پھر بند ہونے لگتیں۔ پھر آپ ہی آپ تائی اماں کی آنکھ کھل جاتی۔ اسی طرح لیٹے ہوئے کنواڑ ذرا کھول کے باہر دیکھتیں "دھوپ ہے ابھی تو" اور غنودگی انہیں پھر آ لیتی — پنکھا اسی ایک رفتار سے گردش کرتا رہتا، گردش کرتا رہتا، مگر پھر نوری کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگتے اور آنکھوں میں نیند اترنے لگتی، ایک جھپکی آئی، پنکھا بند، پھر آپ ہی آپ چونک پڑتی اور پھر پنکھا چلنے لگتا۔ بڑی آپا سوتے سے ایک ساتھ اٹھ کے بیٹھ جاتیں، کنواڑ کا ایک پٹ کھول کے دیکھتیں اور گھبرا اٹھتیں "اے ہے دھوپ چبوترے پہ پہنچ گئی۔ ظہر کا وقت گزرا جا رہا ہے" اور آہستہ سے کنواڑ کھول باہر نکل جاتیں۔

آنکھ اس کی لگتی اور کھل جاتی۔ تائی اماں اور بڑی آپا کی مانند نیند اسے کب آتی تھی۔

پہاڑ سا دن کٹنے میں نہ آتا اور لمبی دوپہر اور لمبی ہوتی چلی جاتی۔ باوا ایک نیند لیتے اور گاؤ تکیے کے سہارے آدھے لیٹے آدھے بیٹھے عینک آنکھوں پر لگا پھر کاغذ پڑھنے شروع کر دیتے۔ تحینہ کروٹ لیتی، چوڑیوں کا ایک میٹھا مدہم چھناکا ہوتا، وہ اٹھ کھڑی ہوتی۔ امی آنکھیں کھول دیتیں "بیٹی تجھے دوپہری میں قرار نہیں ہے گھڑی بھر کو تو آرام کر لیا کر۔" "ممانی جی کلپ کل سے پڑا خراب ہو رہا ہے۔" "ہاں کلپ بچے تو اسے بھی دھو ڈالو۔" امی لیٹے لیٹے دوپٹہ اتارتیں اور تحینہ کو پکڑا دیتیں۔

بند اندھیرے کمرے میں لیٹے لیٹے اس کا دم الٹنے لگتا۔ آہستہ سے اٹھتا اور باہر نکل آتا۔ تپش سے تپتا دالان آباد دکھائی دیتا۔ کمرے کے دروازوں پر لٹکی ہوئی پانی میں ترالو خس کی ٹٹیاں کہ پانی اس سے رس رس کر دالان میں بہتا ہوتا، پانی سے لبالب بھری ہوئی ناند جس کے پانی میں اچھے اور بنی چھپاکے لگاتے ہوتے اور پھر ایک ساتھ چھوڑ چھاڑ دالان سے چھو ہو جاتے، دالان کے بغلی در میں بیٹھی ہوئی تحینہ، پاس مٹکے کی پیچ سے بنا ہوا کلف دیگچی میں رکھا ہوا، اجلے میلے دوپٹے، صابون، پڑیاں اور کاغذ کی پڑیوں میں بندھے ہوئے رنگوں کے منجملہ ململ کی دھجی میں لپٹی ہوئی فیروزی رنگ کی ڈلی کہ اس سے نکلتی سنہری لہر دور سے چمک مارتی۔ تسلے میں کلف انڈیلنا اور دوپٹے کو خوب مل مل کر دھونا پھر کھنگال کر تسلے میں اجلا پانی انڈیلنا اور رنگ رنگ کی پڑیا گھول کر دوپٹہ رنگنا، نچوڑنا، انہیں کھول کر جھٹکنا اور آنگن میں تنی ہوئی الگنی پہ دھوپ میں پھیلا دینا۔ خربوزوں کے گودے سے بھری سڑی ہنڈیا اٹھا لانا اور گودے کو اتنا ملنا اتنا ملنا کہ بیج گودے سے الگ ہو جاتے کہ تب انہیں پتیل کی چھلنی میں ڈال کر پانی کا لوٹا الٹا تڑ بڑے دینا کہ وہ چاندی سے چمکنے لگتے، کچھ بیجوں کو ہرا رنگنا کچھ کو سرخ اور ان کے ہار گوندھ لینا۔

کچے دالان کے کسی کونے میں پٹ سے آواز ہوتی، دونوں چونک کر ادھر دیکھتے اور اسی دم اچھے اور بنی جانے کہاں سے ایک دم سے داخل ہوتے اور شور مچانا شروع کر دیتے

"تیلیا راجہ، باجی تیلیا راجہ..... ضمیر بھائی دیکھو تیلیا راجہ"، واقعی جیسے تیل میں ڈوبا ہو کالی چمکتی ڈلی سی، تیلیا راجہ بھن بھن کرتا دیوار سے ٹکراتا، ٹکرا کے زمین پہ ٹپ سے گرتا اور اپنے سوراخ سے تیز تیز مٹی کریدنا شروع کر دیتا۔ تیلیا راجہ کا ہنگامہ پرور ڈرامائی عمل ابھی جاری ہوتا کہ اچھے کی نظر بھٹکتی اور دالان کے بغلی در میں ایک بڑھیا آہستہ آہستہ رینگتی بھٹکتی کھلی پڑتی، جو دالان سے نکل آنگن میں پہنچتی اور تیرتی تیرتی اوپر اٹھنے لگتی، یہاں تک کہ سامنے والی دیوار کی منڈیر کو چھوتی معلوم ہوتی "بڑھیا، بنی بڑھیا"، اور اچھے اور بنی دونوں دالان سے نکل آنگن میں ہوتے ہوتے تیر کی طرح زینے میں داخل ہوتے اور گم ہو جاتے۔ پھر وہی بھائیں بھائیں کرتا دالان اور پھر وہ اور تحسینہ اکیلے۔ اکیلے لمحے جن کی وہ تمنا کرتا رہتا لیکن آتے یہ وہ کتنے سخت گزرتے، ایک گومگو کی کیفیت، دھڑ دھڑ کرتا دل: اور تحسینہ اسی انداز سے گویا اسے کسی بات کی خبر نہیں گودے میں سنے خربوزے کے میلے گدلے بیجوں کو ملتی رہتی، ملتی رہتی مگر پھر آپ ہی آپ اس کی گردن پہ پسینے کے اجلے قطرے ابھرنے لگتے اور بیج صاف کرنے کا شغل ایک مشینی عمل بن جاتا، لگتا کہ اس کے ہاتھ اسی انداز اسی رفتار سے بیجوں بھرے گودے کو ملتے رہیں گے کہ اچانک وہ ہاتھوں کو تڑ تڑ سے دیتی اور اٹھ کھڑی ہوتی۔ اٹھتے اٹھتے کہ ایک طرف ہوتا اسے اڑتی نظر سے دیکھتی چلتے چلتے بظاہر سادگی سے کہتی "بہت تپش ہے کیوں بیٹھے ہو گرمی میں یہاں؟" تپتے دالان میں بیٹھے رہنے کا کوئی عذر اس کے پاس نہ ہوتا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کھڑا ہوتا اور کبھی اندر بڑے کمرے میں چلا جاتا اور کبھی باہر ہو لیتا۔

باہر جاتے جاتے اس نے عذر پیدا کیا "تحسینہ"

تحسینہ ٹھٹک گئی۔

"پیسے دے دو کچھ"

دالان سے نکلتے نکلتے وہ مڑی اور بغلی کمرے کی طرف ہو لی۔ پیچھے پیچھے وہ۔ پھر آہستہ سے اندر آ گیا، بغلی کمرے میں صندوق کے پاس جہاں وہ پیسے نکال رہی تھی۔ اجلے موتی سے

قطرے گردن پہ پھر ابھرنے لگے اور گردن پر پڑے ہوئے اکا دکا بال بھیگنے لگے اور ہاتھ جلدی جلدی کپڑوں کو الٹنے پلٹنے لگے۔ کپڑوں کے نیچے سے اس نے روپیوں کی صندوقچی نکالی، روپیہ نکال کے اسے دیا کہ وہ لمبی گوری انگلیاں اس کے ہاتھ کے برابر آگئیں اور پھیلے ہوئے ہاتھ میں نادانستہ ایک ارادہ پیدا ہوا، ایک جنبش، مگر پھر وہی رکاوٹ کی کیفیت۔ وہ صندوق بند کر آہستہ سے باہر نکل گئی۔

دہلیز میں وہ چند لمحے چپ چاپ کھڑا رہا۔ دل اس کا آہستہ آہستہ دھڑکنے لگا تھا۔ کھڑا رہا، پھر جی ڈھینے لگا۔ کمرے سے نکل کر دالان میں آیا کہ اب خالی تھا اور دالان سے سونتا ہوا باہر نکل گیا۔

سرخ پتھروں والا مندر دور سے آنچ دے رہا تھا۔ بہت اونچائی پہ اندھیری کھڑکی میں لگی ہوئی وہ لوہے کی چرخی کہ صبح و شام مسلسل گھومتی اور شور کرتی تھی، اب شانت تھی۔ مندر والی گلی سے نکل بیاؤ کی گلی سے نکل رہا تھا کہ لڑکوں کی ایک بے ہنگم ٹولی نے رستہ اس کا روک لیا۔ کالے کلوٹے لڑکوں کے اس غول میں گورے چٹے لونڈے بھی تھے۔ لیکن منہ پہ توے کی سیاہی مل کر سب ایک سے ہو گئے تھے۔ بعض نے بس قمیض اتارنا کافی جانا تھا بعض نے کہ بہت چھوٹے تھے۔ سب کپڑے اتار اپنے تئیں ننگا کر لیا تھا۔ کچھ لے کپڑے اتار لنگوٹ کر ان کے جسم سے ہم رنگ تھے، کس لئے تھے۔ بیچ سڑک پہ کھڑے، ہاتھوں میں چھڑیاں اور چھوٹے چھوٹے ڈنڈے بجاتے شور مچاتے۔

کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے

کوڑی کھیت لگائے گا برسے گا برسائے گا

کوڑی گئی ریت میں پانی گیا کھیت میں

بیچ سڑک پہ رکھی ہوئی تھالی، تھالی میں ایک دو اکنیاں بہت سے پیسے کچھ دھیلے، ہر آتے جاتے سے مطالبہ کہ تھالی میں پیسے ڈالو، دلہا پکائیں گے، مینہ کی دعا کریں گے۔

تنہائی میں اُکنی ڈالی تو لڑکوں نے رستہ چھوڑا اور وہ آگے بڑھا۔ مگر اب اس کے قدم نہیں اُٹھ رہے تھے۔ قدم کہ رک گئے تھے مڑے اور آگے جاتے جاتے وہ پلٹ پڑا۔

شام کو دسترخوان پہ بڑی آپا کو پھر ضمیر کی فکر ہوئی "اری تحسینہ ضمیر کو بلا کے لانا کہ کھانا کھاؤ بھیا۔"

تحسینہ رُکی، پھر رُک کر قریب گئی "کھانا" اس نے آہستہ سے کہا۔

ایک اونگھ سی اس پہ طاری تھی اور سر مونڈھے کی پشت پہ ڈھلکا ہوا تھا۔ آنکھیں اسی طرح بند رہیں، آہستہ سے جواب دیا "بھوک نہیں ہے۔" چپ۔ پھر آنکھیں کھولیں، بولا "طبیعت خراب ہے میری، کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

تحسینہ خاموشی سے مڑی اور واپس بڑے کمرے میں۔

اس کی طبیعت واقعی خراب ہو گئی تھی۔ امی نے اس کی پیشانی کو چھوا، اس کی کلائی کو دیکھا، بولیں "بدن گرم ہے۔"

تائی اماں کو امی کے اس بیان سے تشفی نہیں ہوئی۔ خود ماتھے اور گالوں کو چھو کے دیکھا، بولیں "بہو کیسی باتیں کرے ہے۔ لونڈا تو بخار میں بھن رہا ہے۔"

بڑی آپا نے اپنے طور ماتھے اور رخساروں کو چھوا، انگلیاں ماتھے پہ رکھیں، پھر لوپرا ہاتھ گال پہ رکھا، بولیں "بی بی، بدن تپ رہا ہے۔"

"میں نو جانوں لُو لگی ہے۔" تائی اماں بولیں۔

"اجی لُو تو لگنی ہی تھی" بڑی آپا کہنے لگیں "دوپہر لوں میں مارا مارا پھرے ہے۔ برسوں میں بھتیجا آیا تھا، پھوپھی کے پاس بیٹھتا، باتیں کرتا۔ مگر بھتوں وہ ایک دن میرے پاس آ کے نہ بیٹھا۔ جنیں لیا ہو کہتا ہے پردیس جا کے۔ بہو تم کیوں نہ آئیں اسے۔ اُس کا جی نہیں لگتا یاں۔"

"بی بی پہلے تو ایسا نہ تھا۔" تائی اماں بولیں "جب یاں تھا تو ہر وخت بڑی آپا بڑی آپا کہے تھا۔"

"بھتوں وہ تو پردیس میں جا کے بدلا ہے۔" پھر بڑی آپا نے تحسینہ کو پکارا "تحسینہ،

اری امیاہے کوئی جلدی پتا بنا بھٹے کے لئے۔"

بخار گریا کے آیا۔ شروع میں بے ہوشی ہوئی کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ ٹک ہوش آتا تو ٹھنڈا ٹھنڈا احساس ہوتا کہ ہاتھوں پیروں پہ مالش ہو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ پھر غنودگی آ لیتی اور پھر وہی بے خبری۔

دو دن غفلت رہی تیسرے دن ہوش آیا سو ساتھ اس کے بخار بھی ٹوٹنے لگا۔ پسینہ اتنا آیا کہ تا تر بتر ہو گیا اور بڑی آپا ملتے تھے اور گردن اور گلے کو آنچل سے پونچھتے پونچھتے تھک گئیں۔ مقاومت البتہ اسی طرح باقی تھی۔ سر خالی خالی لگتا تھا اور زبان پہ اسی طرح کانٹے سے جمع تھے۔

تائی اماں اور بڑی آپا اور امی دوپہر کی چند گھڑیاں جانیں کس مشکل سے بڑے کمرے میں گزارتی تھیں، چھت میں لٹکے ہوئے جھالر والے لمبے پنکھے سے زیادہ انہیں نیم کی ٹہنیوں سے چھن کر آنے والی ہوا زیادہ بھاتی تھی۔ لو چلنے لگتی اور دھوپ کی تپش تیز ہو جاتی تو نیم کے نیچے سے اٹھ کر اندر جاتیں، لیکن جو نہی دھوپ ڈھلی اور وہ پھر اپنی ٹھیک پر سو دن ڈھلا تو وہ تو باہر نکل آئیں۔ مگر اس پر پابندی تھی کہ شام سے پہلے باہر نہ آئے۔ دروازہ اسی انداز سے بند تھا اور خس کی ٹٹی اسی طرح پانی میں شرابور تھی۔ البتہ روشندان سے شعاع اک جھک کے اندر چلی آتی تھی اور کمرے کے اندھیرے میں ایک سنہری پارہ بھری لکیر تن گئی تھی۔ جو پتہ دیتی تھی کہ سورج کا رخ بدل چکا ہے۔ نوری آدھی سوتی آدھی جاگتی ایک ہی رفتار ایک ہی انداز سے پنکھے کی ڈوری کھینچے چلی جاتی تھی کہ اس میں کبھی کبھی اس کے اونگھ جانے سے جھٹکا آتا اور ہوا کے بہاؤ اور کنڈوں کی گردش سے پیدا ہونے والے یکساں ترنم میں ایک پھندا پڑتا، پھر وہ فوراً چونک اٹھتی اور ڈوری کی گردش اور ہوا کا بہاؤ ان کنڈوں سے نکلنے والی آواز پھر اسی مقررہ ڈگر پہ آ جاتی۔ تحسینہ نے اس کے سر میں کاہو کے تیل کی مالش زور زور سے شروع کی تھی، مگر اب اس کی رفتار بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی اور گھنے گرم بالوں میں گردش کرتی ہوئی انگلیاں پنکھے کی نیند بھری رفتار سے رفتار ملا کر آہستہ آہستہ سرسرا رہی

تھیں، رینگ رہی تھیں۔ اس پہ نیم غنودگی کا عالم تھا۔ پچھلے دو دن غشی اور نقاہت کے گرم دھند میں ڈوبے ہوئے دن اب پسینے سمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے یاد آتے جا رہے تھے۔ گورے پوروں میں تھرمامیٹر کی شیشے کی شفاف نلکی کہ اس کے ہونٹوں میں آجاتی اور پھر وہ لمبی انگلیاں انہیں جھٹک کر بلند کرتیں اور آہستہ سے ایک چاندی سے چمکتے خول میں بند کر دیتیں۔ ہاتھوں اور پیروں پہ ہوتی ہوئی مالش کہ ایک ہی رفتار سے دیر تک جاری رہتی یہاں تک کہ تلووں کو ملتی ہوئی نرم پوٹلی تھم جاتی اور تائی اماں کی کلائیوں میں پڑی ہوئی چاندی کی چوڑیاں بجتیں اور خاموش ہو جاتیں یا کبھی کبھی اس کی ہتھیلی پہ گردش کرتی ہوئی نرم ریشمی پوٹلی ہاتھ کو ہلکے سے تھامے ہوئے مخملیں میٹھی انگلیاں، ریشمیں شیریں چوڑیوں کے ہلکوروں سے رستا ہوا نرم ترنم اور ایک خواب حواس پہ اس کے چھاتا ہوا، ایک شیریں غشی، ایک شہد آمیز نشہ۔ وہ شیریں خوابی کیفیت پھر جاگ رہی تھی۔ لذت سے لبریز ہلکی پتلی بدلیاں حواس پہ پھر اُمنڈ رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ انگلیاں وہ یونہی بالوں میں سرسراتی رہیں اور وہ یونہی آنکھیں موندے آدھ نیندی کیفیت میں ڈوبا رہے تھے۔ نیند بھری کیفیت کچھ گہری ہوئی شعور میں اس کے شہد سا گھل رہا تھا اور حواس پہ خواب کی ایک پتلی تہ چڑھتی جا رہی تھی۔ بغیر کسی ارادہ کسی نیت کے سیدھے ہاتھ کو اس کے حرکت ہوئی اور آہستہ سے سرہانے کی طرف بڑھ گیا۔ کاہو کے تیل میں ڈوبے ہوئے گھنے گرم بالوں میں رینگ کر انگلیاں اس کی گردش کرتی ہوئی گوری انگلیوں میں پیوست ہو گئیں۔ گردش کرتی ہوئی انگلیاں ٹھٹکیں، جہاں کی تہاں جمی رہ گئیں۔ جہاں کی تہاں جمی انگلیاں پگھلنے لگیں، بہنے لگیں۔ آگ نے آگ سے تپش پکڑی، گرم سیال رواک انگلیوں سے انگلیوں میں منتقل ہوتی ہوئی، نشیب سے ابھر کر نشیب میں بہتی ہوئی: الگ الگ بہتی ندیاں اُمنڈ کر کناروں پہ سے بہ نکلی تھیں، ایک دوسرے میں بہنے لگی تھیں، گھل مل کر ایک رُخ بہہ رہی تھیں۔ کالے لمبے بالوں کی گرم گھنیری سے نکل کر جکڑے ہوئے ہاتھ ہونٹوں کے قریب آگئے۔ جلتی پگھلتی گوری گوری

انگلیاں پیتے ٹوٹتے بخار والے تپتے کانپتے ہونٹوں پاس آ کانپیں، ہونٹوں سے نکلتے گرم سانس میں بہہ نکلیں، مگر ایکا ایکی وہ بے قابو ہوا اس گرم گرفت کو چھڑا کر نکلیں۔ وہ سرہانے سے ایک ساتھ بڑبڑا کر اُٹھی اور چل کھڑی ہوئی۔

دور ہوتے ہوئے قدموں کی چاپ کے ساتھ دروازہ عجلت میں کھلا اور بند ہو گیا آنکھیں اس کی اسی طرح مندی ہوئی تھیں، مگر حواس پر چھائی ہوئی خواب کی گہری ہوتی گھٹا پھٹ گئی تھی۔

(۴)

صبح آنکھ اس کی سویرے منہ اندھیرے کھلی کہ بڑی آپا ابھی نماز کی چوکی پہ تھیں اور ان کی پُرسوز رقت بھری آواز مولا علی، وکیل علی، بادشاہ علی، صحن میں پھیل رہی تھی، رقت کی یہ کیفیت کہ بڑی آپا کا جسم پگھل رہا ہے اور کوئی دم جاتا ہے کہ وہ بہے گا اور صبح کے پاکیزہ دھندلکے میں حل ہو جائے گا۔

گھر سے نکلنے پہ کہ آج بیماری سے اُٹھنے کے بعد کئی دن میں قدم باہر نکالا تھا اور نور کے تڑکے ٹہلنے چلا تھا اسے ساری فضا نئی نئی نظر آئی اور اُجلی، لال مندر کہ جس کی بلند درختے والی چرخی مسلسل گردش میں تھی، لمبی ڈوریوں میں بندھی ہوئی چھوٹی بڑی پیتل کی گڑویاں اور لوہے کی ڈولچیاں کہ تیزی سے نیچے چلتیں، کنوئیں کے اندھیرے میں گم ہو کر کھنکھناتیں اور پانی سے لبالب بوندیں ٹپکاتیں پھر اسی درختے میں چھپ جاتیں، ٹھٹھروں والی گلی کہ ابھی دکانیں بند اور فضا شور سے پاک تھی، بس ایک بھنگن جھاڑو دیتی تھی، جس کی جھاڑو سے اڑتی ہوئی گرد نے گلی سے ایک نرم رو صبیح دھند کا غلاف چڑھا دیا تھا، گلیوں سے پرے بستی سے باہر چلتی ہوئی وہ سفید کنکروں کی گڈھوں والی پتلی سڑک بھی جس پہ چلتے ہوئے پیر اس کے گھٹنوں تک خاک میں اٹ پٹ چلے تھے اور بستی کی انتہا پر کھڑا ہوا سُرخ اینٹوں والا موٹا ٹھس ستون، رات کی رخصتی کا نقیب کہ اب گرجیوں میں یوں چپ تھا کہ نوحہ خوانی اور مناجی

کا فرض گویا اسے پھر ادا ہی نہیں کرنا پڑے گا۔ بستی کی انتہا کو اس نے چھوا اور پلٹ پڑا قدموں کے نیچے سے نکلی ہوئی سڑک پھر قدموں کی زد میں تھی، کبھی کنکروں کی کھردری زمین قدموں میں بجتی ہوئی، کبھی ادھڑی سڑک جہاں کنکر غائب تھے اور قدم رکھنے سے خاک اڑتی تھی اسکول والا باغیچہ نظر آنے پر سڑک سے اتر دگڑھے میں آیا جہاں منوں مٹی تھی کہ پیر اس کے دھنس دھنس گئے اور دگڑ پار کر اسکول کی صاف شفاف پگڈنڈی پر۔

وہ ایک خاموش شہر میں داخل ہو گیا تھا۔ سرخ اینٹوں کے دروں کی وہ لمبی قطار، وہ برآمدہ کہ کھنچا چلا گیا تھا، دور سے دیکھنے پہ لگتا کہ یہ عمارت ان گنت دروں اور ایک لمبے برآمدے اور کھپریل کی جھکی ہوئی نیچی چھت کے سوا کچھ نہیں، مگر قریب آئے پہ عمارت بلند ہونے لگتی اور پھیلتی چلی جاتی۔ اونچے اونچے در، اندر چمکتے شیشوں والے ان گنت دروازے اور دریچے گرداگرد پھیلی ہوئی فیلڈ، جہاں کہیں کہیں سفید کھمبے کھڑے تھے اور ہاکی اور فٹ بال کی فیلڈوں کی سرحدوں کا پتہ دیتے تھے۔ کلاسوں کے دروازے مقفل تھے، برآمدے خالی اور فیلڈ خاموش۔ اسکول بند تھا۔ شہر، جس کے دھوئیں مچلتے آسمان سر پر اٹھاتے۔ ننھے شہری سال کے سال، ہجرت کر جاتے اور شہر خالی اور سنسان ہو جاتا۔ ان دھوؤں اور اس سناٹے دونوں سے اس کی آشنائی تھی۔ چھٹیوں کی صبحوں میں ابا میاں کے ساتھ بھونرٹ کے کھیتوں میں گھومتے اکثر اس نے آنکھ بچا کر رستہ کاٹا ہے اور پھول توڑنے کی نیت سے اسکول میں پہنچا ہے جب وہ سکول کی پست چہار دیواری کو پھاند کر اندر داخل ہوتا تو یہاں کی ہر چیز دیکھی بھالی اور برتی ہوئی ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی بستی میں محسوس کرتا، جہاں کے باسی کسی جادو کے اثر سے یا کسی دیو کے ڈر سے بستی خالی کر گئے ہیں۔ وہ فیلڈ کا چکر لگاتا، فیلڈ میں کھڑے ہوئے سفید ستونوں کو چھو کے اور ہلا کے دیکھتا، خالی برآمدوں میں گھومتا۔ خالی برآمدے، بند دروازے، اکا دکا دروازے کا شیشہ ٹوٹا ہوتا اور وہ جھانک کر نیم اندھیرے میں چمکتے ڈیسکوں اور کرسیوں کو دیکھتا، دیکھتا رہتا اور پیچھے ہٹ جاتا، کسی

دروازے کا قفل غائب ہوتا اور دروازہ اک ذرا کھلا ہوتا، حیرانی اور ڈر کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس کے ہاتھ کنواڑوں کو آہستہ سے کھولتے، چپکے چپکے اندر جاتا، تعجب سے خالی فرش کو بند دریچوں کو ادھ کھلے روشندانوں کو دیکھتا، پھر دل اس کا دھڑکنے لگتا، باہر نکلتا اور بغیر پھول توڑے اس کی حدود سے باہر چلا آتا۔

ماضی کی مہک اُسے پھر آنے لگی تھی اور بیتے دنوں کا جادو دل و دماغ میں جاگ رہا تھا وہ باغیچے میں ہولیا۔ دھلے دھلے پودے اور جھاڑیاں، اُجلے سفید پھول گویا سبزے میں چاندنی چٹکی ہے۔ تتلیاں کہ پودوں کو ہاتھ لگانے سے بے قرار ہوتیں اور ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہو فضا میں بھٹکنے لگتیں۔ شبنم سے تر ابور پتوں اور مہکتے پھولوں میں سفر کرتی انگلیاں ایک اور سفر پر نکل گئیں، انگلیوں کی گرفت میں، وہ شہد آمیز لمس پھر جاگ رہا تھا اور پودوں اور انگلیوں اور ہتھیلی میں میٹھی کن من ہو رہی تھی۔ پھولوں سے اس کا رومال بھر گیا تھا۔ اس نے رومال کو گانٹھ دی اور باہر نکل آیا۔

خاک سے اٹی سڑک، قدموں تلے بجتے ہوئے کنکر، پولی زمین، دگڑا، پگڈنڈیاں کھیتوں کی مینڈھیں، پیر اس کے کبھی شبنمی گھاس کو روندتے ہوئے گیلے ہوئے کبھی دگڑے میں چلتے چلتے گرد آلود ہوئے۔ دور سے ہیرا کے الاپ لگانے کی آواز آ رہی تھی۔ تو بھونڈ کی حدیں شروع ہو چکی تھیں۔ کبھی تیلی پگڈنڈی پر، کبھی کھیتوں کی بنیڈھوں سے گزرتا ہوا وہ نیم اور کھنڈال کے درختوں کے پاس جا پہنچا۔ اس نے نیم کی ٹہنی مسواک کی غرض سے توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا کہ ٹہنیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور گرگٹ ایک ہرے پتوں سے نکل کر ٹوٹے گدے پر آ گیا۔ ادھ ٹوٹی شاخ کو چھوڑ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ گرگٹ پھولتا گیا پھیلتا گیا۔ کانٹے سر کے اور پشت کے کھڑے ہو گئے اور منہ کی دھکتی ہوئی سرخی گردن میں گردن سے پشت میں تیرنے لگی۔ دل اس کا دھڑکنے لگا، ایک مبہم سا ڈر کہ کوئی یورش ہونے والی ہے۔ رنگ زرد سے سرخ، سرخ سے ہرا ہوا۔ پھر اس کا رخ گھنی ٹہنیوں کی طرف،

ہوگیا۔ پیلی پیلی دم کچھ دیر تک اس جگہ ٹھہری ہوئی نظر آئی، پھر وہ بھی سٹک کر پتوں میں گم ہوگئی۔

ایک موہوم ڈر، اکیلے پن کا مبہم احساس، ذہن کے کسی گوشے میں ابھرتا دبتا وہم کہ جسم کا ایک پلی خون گھٹ گیا ہے۔ رُخ اس کا پہلے کنوئیں کی طرف ہوا، پھر چلتے چلتے اس نے رستہ بدلا اور سیدھا گھر کی طرف ہولیا۔ جہاں کبھی کالے پیلے دانوں والی جھاڑیاں، آک کے پودے سفید کانٹوں اور میلی پتیوں اور پیلے پھولوں والے ٹیڑھے میڑھے ببول کے درخت تھے۔ اب اس میدان کی شکل بدل رہی تھی۔ جابجا سیمنٹ کے ڈھیر تھے اور سرخ اینٹوں کی دیواریں۔ کوٹھی کی تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی، مگر اتنے آثار اس کے ظاہر ہونے لگے تھے۔

جب اس نے گھر میں قدم رکھا ہے تو دیواریں اُجلی ہو چلی تھیں اور سب سے اوپر والے کوٹھے کی ممٹی پہ سنہری دھوپ دمکنے لگی تھی، مگر بڑی آپا ابھی نماز کی چوکی پہ تھیں اور ان کی پُرسوز رقت بھری آواز مولا علی وکیل علی بادشاہ علی صحن میں پھیل رہی تھی۔ تائی اماں دعا مانگتے مانگتے ابھی سجدے میں جھکی تھیں۔ امی اسی طرح سنا رہی تھیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب پریشان کرتی مکھیوں سے مدافعت کی غرض سے دوپٹے کا آنچل ان کے چہرے پر آگیا تھا۔ تجو نہ اٹھ بیٹھی تھی پر آدھی سوتی آدھی جاگتی تھی، نیند کی ننھی بدلیاں کہ چھنٹ کر پھر گھل مل رہی تھیں اور آنکھیں مندنے لگی تھیں کہ اس نے بڑھ کر پھولوں کا رومال اس کی گود میں رکھ دیا۔ نیند کی ننھی بدلیاں آن کی آن میں غائب، اور آنکھیں حیرانی اور استفسار کی غیر واضح کیفیت کے ساتھ اس کی طرف اُٹھ گئیں۔

"پھول ہیں"، جواب میں وہ بولا، اور دل اس کا دھڑکنے لگا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر دالان کی طرف ہولیا۔

دالان میں اور خالی کمروں میں مصروف بن کر وہ دیر تک گھومتا رہا۔ بڑے کمرے میں، بڑے کمرے سے بغلی کمرے میں، بغلی کمرے سے پھر بڑے کمرے میں۔

جب باہر آیا تو صحن اُسے پھولوں سے اجلتا مہکتا معلوم ہوا۔ پھول نانی اماں کی چاندی کی بالیوں میں تھے، پھول بڑی آپا کے کانوں میں تھے کہ ابھی باورچی خانے کی طرف گئی تھیں پھولوں سے تحسینہ لدی پھندی تھی کہ کانوں میں مہکتے گچھوں کے اثر سے رخساروں کے پھولوں میں رنگ دوڑا تھا اور چہرہ کھلا پڑتا تھا، پھولوں کے لئے بنی ٹھنک رہی تھی کہ کانوں میں پہننے پہ قانع نہ تھی بلکہ ہار بھی چاہتی تھی۔

"بس اب اور پھول نہیں ہیں۔ تجھے تو ہاؤ کا ہو گیا ہے۔"

"باجی گجرا۔"

"ذرا سے تو رہ گئے ہیں۔ اس میں گجرا کیا بنے گا۔ کل پھر ضمیر بھائی لائیں گے تو پھر گجرا بنائیں گے۔ ہیں نا" تحسینہ کی آواز میں پیار کے ساتھ ساتھ ایک لہک بھی تھی۔

بنی کو کل کے وعدے سے تسکین نہیں ہوئی "تمہارے پاس اتنے تو ہیں۔"

"کہاں اتنے ہیں؟ چار کلیاں رہ گئی ہیں" اور اس نے پھیلے آنچل کو سمیٹ لیا۔

بنی پہلے ٹھنکی، پھر روٹھ کے منہ پھلایا، پھر بسورنے لگی اور جب تحسینہ پہ کوئی وار کارگر نہ ہوا تو اس پہ ٹوٹ پڑی۔ تحسینہ نے کہ اس نے آنچل پھر پھیلا لیا تھا اور اطمینان سے پھول گوہ رہی تھی جلدی سے آنچل کو سمیٹا، بنی کے ہاتھ پکڑ کر پھول چھینے اور اسے پیچھے دھکیل کے ہنس پڑی "باؤلی ہوئی ہے" سر سے آنچل کاندھے پر کھسک آیا، جوڑے میں لگے ہوئے کئی پھول افشاں کی طرح چھٹ کے گرے اور ایک لٹ سرخ ہوتے گالوں پہ آ پڑی "ایک دفعہ کہہ تو دیا کہ اب کل ہار بنائیں گے۔ مانتی نہیں ہے" وہ پھر ہنس پڑی "بالکل وحشی ہے۔"

"تحسینہ سر ڈھکو" امی نے تہدید آمیز لہجے میں کہا۔

تحسینہ سناٹے میں آ گئی۔ سر ڈھکا، سینے سے سرکتے آنچل کو درست کیا، بالوں کی لٹ اوپر کی، پھر گم۔ امی نے پاندان اپنے پاس سرکایا، کھول کے پان لگانے لگیں۔

"نانی اماں پان کھاؤ گی؟"

"بس ایک کتر لگا دے بہو۔"

نانی اماں بولیں، امی پھر خاموشی سے پان لگانے لگیں۔ تحسینہ گم سم، اور بنی ششدر کہ بات کیا ہوئی۔ اور خود وہ، پیشانی پہ پسینہ سکتے کی کیفیت، گویا امی نے تحسینہ کو نہیں اسے ڈانٹا ہے۔

"اجی ہم تو یہ جانیں ہیں" امی آخر بولیں "کہ جب تک ماں کے گھر رہے۔ پھولوں کی مورت ماں نے نہ دیکھنے دی۔ چوری چھپے کبھی پھول مل بھی گئے تو کانوں کو چھپاتی پھرتی تھی کہیں اماں نہ دیکھ لیں، خون پی لیں گی مگر اب تو پھول فیشن ہیں۔"

"ہاں" نانی اماں یاس بھرے لہجے میں بولیں "اب تو ڈوبا ہر عیب فیشن ہے۔"

"ہاں بے پردگی فیشن، سر کھلا رہے تو فیشن، نیچا گریبان فیشن۔ دیدے پھٹ گئے ہیں لڑکوں کے۔ ہمارے زمانے میں ایسا کاہے کو تھا۔"

"تم نے تو کل ہوش سنبھالا ہے بی بی،" نانی اماں کہنے لگیں "ہمارے زمانے میں تو ڈوبا ایسا پردہ ہووے تھا کہ کیا مجال کہ غیر مرد آواز بھی سن لے۔ بڑی اماں، اللہ بخشے بڑی جنتی تھیں، سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ مگر سقے نے کبھی اُن کی پنڈلی نہیں دیکھی۔ بی بی، ان دنوں تو ماں باپ سے بھی پردہ ہووے تھا۔ بنیا دھلی جو ہیں ان کی ایک بہن تھی۔ بڑی بدنصیب تھی کم بخت نہ تو پھول کھلے نہ باپ بھئے کی صورت دیکھنی نصیب ہوئی۔ باپ باہر بیٹھا بیٹھا حکیم ڈاکٹروں کا انتظام کرتا رہا، بیٹی اندر دم توڑتی رہی۔ وہ جتنی صورت خاک کے پردے میں چھپ گئی۔ کیا اپنے کیا غیر کسی مرد نے جھلک اس کی نہ دیکھی۔"

تحسینہ خاموشی سے اٹھی اور باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ بنی بھی کچھ حیران کچھ سہمی ہوئی اس کے پیچھے ہو لی۔

امی تحسینہ کو اٹھتے اور جاتے غور سے دیکھتی رہیں، جب وہ باورچی خانے میں داخل

ہو گئی تو اس کی نظریں پھر اپنے مقام پر واپس آ گئیں۔

"بی بی کوئی بُرا مانے یا بھلا مانے۔" اور امی کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا "ہمیں ایسی بے حجابی پسند نہیں۔"

"بُرا ماننے کی اس میں کیا بات ہے" تائی اماں بولیں "کوئی غیر تو ہو نہیں، اور پھر ڈوبی بات کوئی ایسی نہیں کہی۔ بڑی بات دیکھی، ٹوک دیا۔ بڑوں کا کام ہی یہ ہوتا ہے۔"

امی کہنے لگیں "تائی اماں میں تو ڈروں ہوں کہ کوئی بات الٹی نہ لے لی جائے۔ آخر سیانی لڑکی ہے، ایسا بھی کیا کہ نگوڑی نہ آنکھ میں حیا نہ چال میں حجاب، سر اور سینے کی سدھ نہیں، ایک آدھ دفعہ میرے جی میں آئی کہ کہوں بیٹی سیانی لڑکیاں کمر جھکا کے چلا کرتی ہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ بھینا تجھے کیا، مفت میں بُری بنوں۔"

"خیر یہ تو بی بی تیری خواہ مخواہ کی بات ہے اپنوں میں ایسی غیریت تو ہوتی نہیں ہے۔"

"تائی اماں اس میں غیریت کی بات نہیں ہے۔ کنواری لڑکی کا معاملہ نازک ہوتا ہے۔ ماں کی آنکھ اسے ٹھیک رکھتی ہے۔ بڑی آپا کے ہوتے ہم کون کہ ٹوکیں۔ ان پہ لازم ہے کہ وہ روک ٹوک کریں۔"

"اری وہ تو ابا میاں جب سے گزرے ہیں ایسی بے سدھ ہے کہ کسی بات کو دیکھے ہے نہ ٹوکے ہے۔"

امی چپ ہو گئیں۔ تھالی چھالیوں کی آگے کی اور چھالیا کترنے لگیں۔ پھر سوچتے سوچتے بولیں۔ "اجی میں تو جانوں بڑی آپا کو اب بیاہ اس کا کر دینا چاہیئے۔"

تائی اماں چپ رہیں۔ پھر آہستہ سے بولیں "بنیاد علی کا خط پھر آیا ہے۔"

امی چونکیں "اچھا؟ ذکر نہیں کیا بڑی آپا نے۔"

"ذکر کرے گی۔ اب کے تو ذکر کرے ہی گی۔"

"کیوں؟" امی کے کان کھڑے ہوئے۔

"اب کے انہوں نے ہاں اور ناں میں جواب مانگا ہے۔ اب ڈوبا کچھ نہ کچھ طے کرنا ہی پڑے گا۔"

چند لمحے امی اور تائی اماں دونوں چپ رہیں۔

تائی اماں پھر آپ ہی بولیں۔ "ڈوبے وہ بھی سچے ہیں، آخر کب تک بیچ میں لٹکے رہیں۔ کرنی ہے تو کر دو نہیں تو منع کر دو۔"

"آخر سوچ کیا رہی ہیں بڑی آپا، کچھ پتہ تو چلے؟" امی بولیں۔

"بی بی ہمیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ابا میاں زندہ تھے سو ان کی موجودگی میں بنیا دعلی کے بار بار خط آئے پر وہ چپ ہو جاویں تھے۔ چھموں ہے سو وہ چپ ہے۔ اسی چپ چپ میں دن گزرے جارئے ہیں اور لونڈیا کی عمر دن دن بڑھ رئی ہے۔" تائی اماں چپ ہوئیں پھر بولیں "اب بھیا آگیا ہے میں جانوں اس سے مشورہ لے گی۔"

"بھیئے سے اور کون کون سی بات میں مشورے لیئے تھے۔" امی کے لہجے میں اک ذرا گرمی آگئی۔

"اس معاملہ میں تو ضرور لے گی۔" تائی اماں چپ ہوئیں، پھر بولیں "ویسے ایمان کی بات ہے کہ ڈوبی کو بھیئے سے محبت تو بہت ہے۔ اندر سے یہ تمنا بھی بڑی ہے کہ بھیئے سے ملوں۔"

امی چپ۔ انہوں نے سر وطہ تھالی میں رکھ دیا، کتری ہوئی چھالیاں ملیں، چار دانے ہتھیلی پہ رکھ کے منہ میں ڈال لئے۔ پھر آپ ہی آپ بولیں "بھئی بہن بھائی کا معاملہ ہے بیچ میں بولنے والی کون، مگر منہ پہ آئی بات تو کہی جاوے ہے؟ میں یہ پوچھوں ہوں کہ جب تحسینہ کا امداد سے نام دھرا گیا تھا اس وقت بھی تو یہی بھیا تھا۔"

"ہاں یہ بھی تو تم سچ کہو ہو۔" تائی اماں بولیں "مگر ایک بات یہ ہے بی بی کہ اس وقت لونڈیا کا باپ زندہ تھا، چھموں بے چاری کی کیا چلتی۔"

امی پھر چپ ہو گئیں۔ چھالیا کترتی رہیں، کترتی رہیں، پھر کہنے لگیں "تائی اماں بات

یہ ہے کہ انہوں نے تو لونڈے پہ چھوڑ دیا ہے اور میں بھی یہی کہوں ہوں۔ ہاں بھئی کل کلاں کو پسند نہ آئے تو ہمیں تلنسے کہ تم نے مجھے جہنم میں جھونک دیا۔" امی خاموش ہوگئیں، مگر بات ان کی شاید ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ چند لمحے رُک کر پھر بولیں، لیکن اس مرتبہ ان کی آواز بہت نیچی تھی، "تائی اماں، یہ لونڈیا اتنی ہوا تو کیوں رہوے ہے۔"

"اے اس کی ماں بھی ڈوبی ایسی ہی ہے۔" تائی اماں نے لاپرواہی سے کہا۔

"تائی اماں، یہ تو ہر وقت خفقانی سی رہوے ہے۔ جانے غریب کو کیا دکھ لگ گیا ہے بڑی آپا ہماری ایسی باؤلی ہیں کہ کسی بات کی سدھ ہی نہیں۔"

تائی اماں نے ایک ساتھ پہلو بدلا "اے ہیئے دھوپ آگئی۔"

دھوپ پھیلتے پھیلتے چارپائی پہ آگئی تھی۔

"اندر چلو" امی اُٹھ کھڑی ہوئیں "ضمیر چلو جا کے اندر بیٹھو"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بغلی کمرے کی طرف ہو لیا۔

دوپہر کو وہ کئی بار کمرے سے نکلا، کبھی پانی پینے، کبھی پیشاب کے بہانے۔ دالان میں آیا، دالان سے صحن میں، صحن سے پھر دالان میں۔ اس دوپہر کو دالان سنسان رہا، نہ دوپٹے رنگے گئے نہ خربوزوں کے بیج دُھلے۔

پھر اس کی آنکھ لگ گئی جب وہ اٹھا اور باہر آیا تو دھوپ ڈھل گئی تھی۔ امی اور تائی اماں اور بڑی آپا سب کے سب باہر نکل آئے تھے۔

"ضمیر باہر آجاؤ، یاں ہوا ہے" بڑی آپا نے اسے آواز دی۔ وہ دالان سے نکل نیم کے نیچے مونڈھے پہ جا بیٹھا۔

"اے چھموں تو نے ٹوک دیا۔ ہوا پھر بند ہوگئی۔" تائی اماں کے ہاتھ میں پنکھا زور زور سے گردش کرنے لگا۔

ہوا واقعی بند ہوگئی تھی۔ اس کی قمیص پشت سے تر بتر ہونے لگی۔

"بہنا بڑی گرمی ہے، میرا تو پنڈا امروڑیوں سے بھل گیا،" امی بولیں۔
تائی اماں بڑبڑانے لگیں "توبہ توبہ آسمان تو تانبا ہوگیا۔ ڈوبی بھوبل برس رئی ہے!"
پھر ان کا لہجہ بدلا اور گڑگڑا کے دعا مانگنے لگیں "الہٰی اپنے حبیب کا صدقہ پانی بھیج....
پانی، کربلا کے پیاسوں کا واسطہ، پانی۔"
بڑی آپا کہنے لگیں "بھنوں، سنیں ہیں کہ نجومیوں نے بتایا ہے کہ اب کی برس پانی نہیں
پڑے گا۔"
تائی اماں نے فوراً ٹوکا "نا بی بی، ایسی آواز مت نکال۔ اللہ رحم کرے۔"
امی بڑبڑانے لگیں "اجی ہم تو یہاں آ کے آفت میں پھنس گئے۔ ایسی گرمی کاہے
کو دیکھی تھی، ہم نے ساون گزر چلا اور بادل کا آسمان پہ نام نشان نہیں۔"
"اری بی بی،" تائی اماں کا تخیل بھٹکنے لگا "یہ کیا سوکھا ہے، سوکھا نو ایسی پڑی تھی... مگر
ہمارا تمہارا تو پتہ بھی نئیں تھا، بڑی اماں سنایا کرتی تھیں کہ ایسی سوکھا پڑی کہ برسات
ساری گزر گئی اور بوند پانی کی نئیں پڑی۔ اساڑھ اجاڑ، ساون سوکھا سوکھا، بھادوں خالی،
آسمان تانبا، زمین تڑخی جادے، چڑیں گھونٹ کو ترسیں اور ڈنگر راتوں کو پیاس سے
ڈکرائیں.... تو بی بی یہ سمجھو کہ اس برس دانہ نئیں اُگا۔ کال پڑ گیا...... سارے میں تراہ
تراہ پڑ گئی۔ ماؤں کمبختوں نے مٹھی بھر چنوں کے لئے گودیں خالی کر دیں اور اک اک نوالے
کے لئے بیٹیں بہا دیں...... وہ جانور کٹا وہ کٹا کہ بس توبہ ہی ہے۔ چرند پرند جو ملا
کاٹا اور کھایا...... اری بی بی، کوا تک عنقا ہوگیا۔
"کوئے بھی؟ اے تائی اماں کیا کہہ رہی ہو۔" بڑی آپا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔
"ہاں بی بی کوئے......" تائی اماں کی آواز میں دہشت کی ایک کیفیت پیدا
ہوتی کوئے...... بی بی کال تھوڑا ہی تھا عذاب الہٰی تھا۔ کال ٹلا تو غدر لوٹ پڑا۔ چولہے
نئیں ہوئیں، پھر ڈاکے پڑے۔ روز خبریں آدیں کہ آج فلاں محلے میں کوئی لگ گیا، آج

فلاں گاؤں میں ڈاکہ پڑ گیا۔ اسے میا اسی میں غدر مچ گیا۔ خلقت ہل گئی۔ وہ گولہ بارود چلا کہ کھڑی حویلیاں زمین کا پیوند ہو گئیں اور حویلیوں والوں کو سر چھپانے کو جگہ نہ ملے اور میادلی میں تو وہ رن پڑا کہ بڑی اماں کیویں تھیں کہ دلی کے کنوئیں خاک سے اٹ گئے اور جمنا سرخ ہو گئی۔

تائی اماں چپ ہو گئیں۔ بہکتے بہکتے جانیں کون سی دنیا میں جا نکلی تھیں کہ آواز بھی ساتھ ان کا چھوڑ گئی تھی۔ بڑی آپا گم سم، آنکھوں میں دہشت کی کیفیت۔ امی بھی چپ، مگر پھر بھی امی نے پہلو بدلا اور تائی اماں کے پورے ہوئے جادو کے جالے سے نکلنے کی کوشش کی "اجی خیر دلی کا کیا ذکر ہے۔ اس شہر کو تو فقیر کی دعا ہے۔ بار بار اجڑے ہے بار بار بسے ہے۔"

تائی اماں اس کو تکتی رہیں وہ خود بھی تو اپنے پورے ہوئے جالے میں گھری ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے پنکھا اٹھایا، جھلنے لگیں پھر بڑبڑائیں "فقیر کی دعا کہ لو یا اعمالوں کی سزا، ہم تو یہ جانیں ہیں کہ بائیس خواجہ کی چوکھٹ میں کوئی راجہ سو برس سے زیادہ تخت پہ نئیں بیٹھا۔ سو برس بعد راج بدلے ہے، رعایا بدلے ہے۔"

"اللہ تیرا شکر" بڑی آپا کی باچھیں کھل گئیں۔ نیم کے پتوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی تھی۔ اور جلتے تپتے بدنوں کو ہوا کے ایک ہلکے جھونکے نے چھوا تھا۔ ڈھلتی دھوپ سے تپتے آنگن میں اچانک چھاؤں میں اتر آئی۔ دھوپ پیروں چلنے لگی، جلدی جلدی سامنے کی دیوار پر چڑھی، منڈیر پر پہنچی، اونچے کوٹھے والی ممٹی پہ سرکتی نظر آئی اور اوجھل ہو گئی۔

"اللہ پانی بھیج" بڑی آپا کی حسرت بھری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

ننھی گدلی بدلیاں جلتی بلتی فضا میں بھٹکتے بھٹکتے قریب ہو گئیں تھیں اور گھل مل گئی تھیں۔ گھلی ملی بدلیاں بلندی پہ رینگتی رہیں، تیرتی رہیں اور سوکھے آنگن میں ٹھنڈی کی رو دوڑنے لگی۔ گھلی ملی بدلیاں پھر چھٹنے لگیں اور دھوپ پلٹی، ممٹی پہ نمودار ہوئی، منڈیر پہ آئی، دیوار دیوار اتری، اور آنگن میں پھیل گئی۔

دروازے کے باہر کھڑ کھڑ کرتا اِکا رکا۔

"اکہ کس کا آیا؟" بڑی آپا چونکیں۔

"ضمیر" امی اس سے مخاطب ہوئیں "دیکھو کس کا اکہ آیا۔" پھر بڑی آپا بولیں "میں جانوں تمہارے بھیے آ گئے۔ مقدمہ تو آج ختم ہو گیا۔"

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف چلا۔

بڑی آپا دھڑکتے دل سے دعائیں مانگ رہی تھیں "الٰہی خیر، اچھی خبر آئی ہو۔"

دروازے پہ پہنچا تو باوا اِکے سے اتر پڑے تھے۔ کھچڑی بالوں میں اور لباس پہ گرد کی ہلکی تہ، چہرے سے سفر کی تھکن ظاہر، اکے والے کا حساب چکایا، بستہ اتروا کر نوکر کے سر پہ دھرا اور تھکے تھکے قدم اٹھاتے اندر چلے۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے۔ آنگن میں قدم رکھا تو گھر بھر کی نگاہیں آس و یاس میں بٹی ہوئی سوال کرتی نگاہیں، ان کی طرف اٹھ گئیں باوا نے جیب سے رومال نکال کر کپڑے جھاڑے، چہرہ صاف کیا، گردن پہ بہتے پسینے کو پونچھا اور مونڈھے پہ بیٹھ گئے، بڑی آپا مونڈھے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں اور زور زور سے پنکھا جھل رہی تھیں۔

"بھیا کیا ہوا؟" تائی اماں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ آہستہ سے بولے "ڈگری ہو گئی"

"ڈگری....."

تیزی سے پنکھا جھلتا ہوا ہاتھ ایک ساتھ رک گیا۔ رک کر پھر چلنے لگا، مگر آہستہ آہستہ۔

کئی منٹ تک خاموشی رہی، سوائے پنکھے کے کہ بڑی آپا کے ہاتھ میں باوا کے سر پہ آہستہ آہستہ گردش کر رہا تھا۔ پھر باوا اٹھنے اور غسل خانے کی طرف چلے گئے۔

وہ نہا دھو کر وہی روزمرہ والا چار خانے دار تہمد باندھے سفید بنیان پہنے غسل خانے سے نکل مونڈھے پہ بیٹھے اور حقے کی نے کو کہ ابھی تازہ کر کے مونڈھے کے سامنے رکھا گیا تھا، ہونٹوں میں دبایا۔ بڑی آپا اور تائی اماں اور امی اسی طرح گم متھان بنی بیٹھی تھیں دھوپ

ڈھل چکی تھی۔ چھاؤں اور ہلکا ہلکا چھڑکاؤ جس نے زمین میں دبی ہوئی گرمی کو ابھارا تھا اور گیلے آنگن سے ابخرات نکل رہے تھے۔ باوا نے حقے کی نے کو ہونٹوں سے الگ کر کے اسے جڑ سے تھاما اور فاصلے سے رکھ پھر ہونٹوں میں دبا لی۔ وہ تھکن اور پریشانی کہ اسکے سے اترتے وقت بشرے سے عیاں تھی ڈھل سی گئی تھی۔ شاداب حقے کی سوندھی خوشبو اور خواب آور گڑگڑاہٹ کے ساتھ ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ حقے کی گڑگڑاہٹ، باوا کی بند آنکھیں، بڑی آپا اور امی اور تائی اماں کہ گم سم بیٹھی تھیں۔ خاموشی اتنی کہ اس کا دم بند ہونے لگا۔ بار بار اس نے ارادہ کیا کہ وہ آہستہ سے اٹھے اور دبے پاؤں باہر نکل جائے۔ مگر اس کا حوصلہ نہ ہوا ایک دفعہ اس نے مصمم ارادہ کیا کہ وہ دبے پاؤں اس دم بند فضا سے نکل جائے کہ اتنے میں ہچکیوں کی آواز آنے لگی۔ بڑی آپا بہت دیر سے دم سادھے بیٹھی تھیں، بند ٹوٹ گیا اور وہ گھٹنوں میں سر دے کے آہستہ آہستہ رونے لگیں۔ باوا نے آنکھیں کھولیں، بڑی آپا کو دیکھا اور پھر بند کر لیں اور حقے کی گڑگڑاہٹ اسی ہموار رفتار کے ساتھ بلند ہونے لگی، ہوتی رہی۔

اس رات حویلی والے سویرے سوئے۔ بڑا والا لیمپ کہ کبھی آنگن میں کبھی چھت پہ کبھی کمرے میں رات گئے تک دھیرے دھیرے جلتا رہتا تھا اور باوا اس کی روشنی میں بڑے ابا کے لیے سیدہ بادامی کا غذات الٹتے پلٹتے رہتے تھے، شام ہی سے منداکر دیا گیا تھا۔

گلی سے گزرتے نکلتے لوگوں کو گمان ہوا کہ حویلی والے آج کسی تقریب پہ گئے ہیں۔

(۵)

اساڑ اجاڑ، ساون سوکھا، اور اب بھادوں گزر رہا تھا۔ آسمان پہ کبھی کبھی بادلوں کے دل کے دل چلتے نظر آتے، مگر سفید دھوپ سے چمکتے باولا سے بادل روپہلی بادلوں کے